نام کتاب	مسجد کی شرعی حیثیت
مؤلف	حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
کمپیوٹر کتابت	مولانا محمد نصیر عالم سبیلی (شعبۂ کمپیوٹر المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)
سن اشاعت	ستمبر ۲۰۰۴ء
صفحات	۴۰
قیمت	روپے
باہتمام	المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد
ناشر	فرید بک ڈپو، نئی دہلی

ملنے کے دیگر پتے

- المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، قبا کالونی، پہاڑی شریف روڈ، حیدرآباد-۵
  فون نمبر:- 040--24440294
- کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، سہارنپور (یو-پی)
- قرآن فاؤنڈیشن، مانصاحب ٹینک، حیدرآباد

فہرست مضامین

ابتدائیہ

گذشتہ سالوں میں بی جے پی حکومت خود مسلمانوں میں اس رجحان کو فروغ دینے کے لئے کوشاں تھی؛ کہ وہ بابری مسجد سے دستبردار ہو جائیں اور اس کی جگہ یہاں مندر کی تعمیر کو قبول کر لیں، اس مقصد کے لئے بعض نام نہاد مذہبی شخصیتوں کو بھی تیار کیا جا رہا تھا، اسی پس منظر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن اور ترجمان جناب ڈاکٹر قاسم رسول الیاس (ایڈیٹر افکارِ ملی) نے دفتر مسلم پرسنل لاء بورڈ کے کانفرنس ہال میں اس حقیر کا خطاب رکھا تھا، جس میں شہر دہلی کے دانشوروں، قانون دانوں اور علماء کی ایک بڑی تعداد نیز سپریم کورٹ کے بعض وکلاء بھی شریک تھے، خطاب کے بعد سوالات کے جواب دیئے گئے، اسی وقت قاسم رسول صاحب نے اس کو تحریری طور پر مرتب کرنے کی خواہش کی، پھر جناب عبدالرحیم قریشی (سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت) نے بھی تعمیر ملت کے زیر اہتمام اسی موضوع پر خطاب رکھا، اور انھوں نے بھی اسے مرتب کرنے پر زور دیا، نیز حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) کا بھی ایماء ہوا کہ اس موضوع پر قلم اُٹھایا جائے، چنانچہ اسی خطاب کو بعض اضافوں کے ساتھ اس حقیر نے مرتب کیا، جو سہ ماہی ''بحث ونظر'' کے شمارہ نمبر ۶۴ (ماہِ جنوری-مارچ ۲۰۰۴ء) میں اشاعت پذیر ہوا، مختلف اہل علم اور بعض قائدین کے خطوط آئے اور زبانی طور پر بھی لوگوں نے اس تأثر کا اظہار کیا کہ اسے افادۂ عام کے لئے مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے، چنانچہ محترم جناب محمد ناصر خاں صاحب (فرید بک ڈپو، دہلی) کی خواہش پر اس کی اشاعت عمل میں آرہی ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی حفاظت کے سلسلہ میں اس حقیر سی خدمت کو قبول فرمائے، واللہ من وراء القصد وهو المستعان۔

۱۴/ جمادی الأخری ۱۴۲۵ھ
۱/ اگست ۲۰۰۴ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم المعہد العالی الاسلامی،

حیدرآباد)

پیش لفظ

بابری مسجد کے تنازعہ کو بعض لوگ صرف ایک مسجد کا مسئلہ سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت اس مسئلہ سے ساری مساجد کا مستقبل وابستہ ہے، ہندو فرقہ پرستوں نے اس گمراہ کن نقطۂ نظر کو عام کیا کہ رام جنم بھومی مندر کا معاملہ ان کے عقیدہ (آستا) کا معاملہ ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے، اگر ہندو برادران کے لئے یہ واقعی عقیدہ کا معاملہ ہوتا تو یہ بڑی بھاری اکثریت اس وقت سے لے کر جب کہ مغل حکمران کمزور ہو چکے تھے، انگریزوں کے ملک پر قابض ہونے تک کیوں خاموش رہتی؟ انگریزوں کے راج میں —— جو ابتدائی دور میں مسلمانوں کو کچل دینے اور ذلیل کرنے کی پالیسی پر گامزن تھا—— کوئی مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا؟ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد (۱۹۷۰ء) کے دہے کے اواخر تک کیوں کوئی آواز نہیں اُٹھی ؟ —— ہندو برادرانِ وطن خاموش اس لئے رہے، انھوں نے کوئی مطالبہ اس لئے نہیں کیا اور ایسی کوئی آواز نہیں اُٹھی، کیوں کہ یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا کہ کوئی رام جنم بھومی مندر اس جگہ پر واقع تھا جہاں بابری مسجد بنائی گئی تھی، مگر عقیدہ کی گمراہ کن بات کو اتنے شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا اور ایسا شور مچایا گیا کہ کئی لوگ دستبرداری پر مائل ہونے لگے اور سمجھوتہ کی بات کرنے لگے، بعض نے مسجد کی ایک یا دو کمانوں کی جگہ مندر کے لئے دے کر یا مسجد کا پورا صحن دے کر باقی حصہ پر اکتفاء کرنے کی تجویز پیش کی، بعض نے کہا کہ جب ایک عرصہ سے بُت رکھا ہوا ہے اور اس کی پوجا جاری ہے، تو اب

یہ مسجد باقی ہی نہیں رہی، بعض گوشوں سے یہ آواز بھی آئی کہ عمارت کے ڈھا دیئے جانے کے بعد مسجد ختم ہوگئی، مسجد کے انہدام نے بہت سوں کے دماغ کو ماؤف کردیا اور ان پر مایوسی طاری کردی۔

ان حالات میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اعلان کیا کہ مسجد خدا کی ملک ہے، جس کو بیچا نہیں جاسکتا، نہ تحفہ میں دیا جاسکتا ہے، نہ کسی سمجھوتہ کے تحت کسی کو منتقل یا اس کے کسی حصہ کو خارج کیا جاسکتا ہے، اس بورڈ نے یہ بھی اعلان کیا کہ ظلم سے بت رکھ دیئے جائیں اور پوجا کا سلسلہ جاری کیا جائے، تو چاہے کتنا ہی عرصہ گزرے مسجد کی حیثیت ختم نہیں ہوگی، مسجد، مسجد ہی رہے گی، عمارت کے انہدام کے باوجود زمین کا وہ قطعہ جس پر عمارت کھڑی تھی مسجد ہی رہے گا اور اس پر مسجد کے تمام احکامات کا اطلاق ہوگا، ان اعلانات نے مایوسی کو توڑا، اور حالات کے جبر کے آگے سر جھکانے کی فکر پر ضرب لگائی۔

2002ء میں گجرات میں مسلمانوں کی خوں آشام نسل کشی ہوئی، وشو ہندو پریشد نے اس قتل عام اور اجتماعی آبروریزی کو بابری مسجد سے جوڑ کر مسلمانوں کو دھمکانے کی پالیسی اختیار کی اور گجرات بنا دینے کا خوف دلا کر مسلمانوں کو دستبرداری پر مائل کرنا شروع کیا، بی جے پی کی سرکردگی میں قائم حکومت نے بھی مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو مجبور کرنے کی کوشش کی، آر-ایس-ایس نے تو اعلان ہی کردیا کہ ہندوؤں کی بات کو مان کر اور ان کو منا کر ہی مسلمان محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں، ذہنی شکست خوردگی کے شکار اب سوچنے لگے کہ مسجد منتقل کی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کو بچانے کے لئے اس سے دستبرداری کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔

ان حالات میں ''مسجد کی شرعی حیثیت'' ایک اہم سوال بن گیا، جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے مشہور عالم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سے خواہش کی گئی کہ ''مسجد کی شرعی حیثیت'' کو واضح کریں، کل ہند مجلس تعمیر ملت کے اسٹڈی سرکل کے تحت اس عنوان پر ایک اجتماع میں مولانا نے دلائل کے

ساتھ ''مسجد کی شرعی حیثیت'' کو بیان کیا، اب یہ تحریر کی شکل میں آپ کے زیر نظر ہے، یہ مضمون سہ ماہی رسالہ ''بحث ونظر'' کے (جنوری - مارچ ۲۰۰۴ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اب کتاب کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں ہے۔

سیاسی حالات کی تبدیلی کے بعد بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی تعمیر کرنے کی سازش رچنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے، ''مسجدیں ہمارے حوالے کرو اور امن کی ضمانت ہم سے لو'' کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں، مگر زیر سطح ہلچل جاری ہے، حالات کے دباؤ سے ہمت پانے والوں اور فوری دستبرداری کی فکر کرنے والوں کے سامنے اللہ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی روشنی میں مسجد کا مقام و مرتبہ اور اس کی شرعی حیثیت کو پیش کرنا بھی بہت ضروری ہے، اس رُخ سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بڑا قابل قدر اور چشم کشا مواد اس کتاب میں فراہم کر دیا ہے، ان کی یہ کوشش لائق ستائش وتحسین اور بہت ہی مفید و کارآمد ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

۲۸/جولائی ۲۰۰۴ء
حیدرآباد

محمد عبدالرحیم قریشی
(سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

vvvvvv

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اشرف المخلوقات حضرت انسان کے لئے بنایا اور بسایا ہے، زمین کی تہوں سے لے کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں اور آفاق کی وسعتوں تک بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی، جاندار اور بے جان جتنی مخلوقات ہیں، وہ براہ راست یا بالواسطہ اسی مشت خاک انسان کی خدمت میں شبانہ روز مشغول ہیں، اور خود انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ'' (۱) اللہ کی بندگی جز وقتی نہیں؛ بلکہ ایک ہمہ وقتی عمل ہے، انسان جس وقت اور جس کیفیت میں ہو، اسے اپنی بندگی کا استحضار رہنا چاہئے، اسے خیال ہونا چاہئے کہ وہ خدا کا غلام ہے اور یہی غلامی اس کے لئے اوجِ کمال ہے، رسول اللہ ﷺ پر عبدیت اور بندگی کا رنگ اس قدر غالب اور کامل تھا کہ آپ کھانا تناول فرماتے تو اس میں بھی تواضع اور فروتنی کا رنگ پوری طرح نمایاں ہوتا اور ارشاد فرماتے: ''أكل كما يأكل العبد''۔ (۲)

اس عبدیت اور بندگی کے استحضار کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لمحات انسان تمام تعلقات سے پرے اٹھ کر خدا کے دربار میں بچھ جائے؛ تاکہ اس میں اپنی بندگی کا شعور تازہ ہوتا رہے، اسی لئے اسلام میں مختلف عبادتیں رکھی گئی ہیں، گو ان سب کا مقصد ایک ہے، لیکن تربیت اور انسان کی خود سپردگی کی آزمائش کے اعتبار سے ان کے طریقے الگ الگ ہیں، ان

میں پہلا

(۱) الذاریات:۵٦ (۲) مجمع الزوائد:۸/ ۵۸۲،حدیث نمبر:۱۴۲۱۰

درجہ نماز کا ہے،توحید ورسالت کے اقرار کے بعد سب سے افضل اور اہم عمل نماز ہے،قرآن مجید میں ۹۵ مواقع پر نماز کا ذکر آیا ہے، حدیثیں جن عنوانات کے تحت ذکر کی جاتی ہیں، ان میں سب سے وسیع حصہ نماز کا ہے،نماز کی حالت میں انسان سر کے بال سے پاؤں تک مکمل طور پر عبادت میں مشغول اور احکام خداوندی کے سامنے سر خمیدہ ہوتا ہے، پورے جسم کو ساکن وجامد اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق جمار رہنا ہے،آنکھوں کو وہاں دیکھنا ہے جہاں آپ ﷺ نے دیکھا، زبان کو وہی کچھ کہنا ہے اور وہی بول ادا کرنے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے ادا کئے ہیں،کبھی ایک اقراری مجرم اور غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے،کبھی اپنے مالک کے سامنے کمر تک جھکتا ہے،کبھی اپنے وقار کی علامت ناک اور پیشانی کو خدا کی چوکھٹ پر بچھا دیتا ہے، نہ حسب خواہش بولنے کی اجازت ہے، نہ چلنے کی، نہ حرکت کی، نہ کھانے پینے کی، گویا پورا وجود غلامی اور بندگی کی تصویر ہے!

پھر اس بندگی کے لئے کچھ اوقات مقرر کئے گئے، اور ان اوقات کے انتخاب میں بھی انسان کی آزمائش اور امتحان کا پہلو رکھا گیا ہے، فجر کے وقت نیند آنکھوں کو دبوچتی ہے، ظہر کا وقت بھی استراحت اور بعض اوقات گرما کی شدت اور تمازت کا ہے،عصر اور مغرب کاروبار کے شباب کا وقت ہے،عشاء کا وقت وہ ہے جب دن بھر کا تھکا ماندہ اور تکان سے چور مزدور گھر آتا ہے اور چاہتا ہے کہ جلد سے جلد گہری نیند کی چادر اوڑھ لے، ان ہی اوقات میں مؤذن میناروں سے دعوت نماز دیتا ہے، گویا روزانہ اور ہر دن پانچ بار مؤمن ایمان اور نفس کی کشمکش کے امتحان سے گذرتا ہے، ایسی عظیم الشان عبادت کے لئے ایسا ماحول بھی ضروری تھا جو ذہن کی یکسوئی اور

قلب کی فراغت کا باعث ہو، جس میں ہر شخص افکارِ دنیا سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مناجات کے لئے یکسو ہو؛ اسی لئے یوں تو روئے ارض پر کہیں بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے، اور یہ اس اُمت کے امتیازات میں سے ہے،(۱) کہ اس کی عبادتیں در و دیوار کی محتاج نہیں، لیکن ماحول کی ہم آہنگی اور موافقت کے لئے کچھ مقامات کو مخصوص کرنے اور انھیں نماز کی ادائیگی کے لئے مختص کرنے کا حکم دیا گیا، یہی عبادت کے لئے مخصوص جگہیں ''مسجد'' کہلائیں، خود قرآن مجید میں ۲۸ مواقع پر مساجد کا ذکر آیا ہے، اور متعین طور پر مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد قباء کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

مسجد کے اصل معنی ہیں: سجدہ کرنے کی جگہ، غور کیجئے تو نماز کا اصل مقصد عجز و فروتنی کا اظہار ہے اور اس فروتنی کا سب سے بڑا مظہر سجدہ ہے، جس میں انسان عظمت و احترام کی آخری علامت پیشانی اور ناک کو بھی خاک پر بچھا دیتا ہے؛ اسی لئے نماز پڑھنے کی مخصوص جگہ کو مسجد سے تعبیر کیا گیا، اسلام میں مساجد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے؛ کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے، اس وقت تو خود کعبۃ اللہ موجود تھا، جو اس کائنات میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد تھی، گو اس پر مشرکین کا قبضہ تھا؛ لیکن جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچنے سے پہلے قباء میں قیام پذیر ہوئے، تو وہیں آپ ﷺ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی، جس کا خود قرآن مجید نے ذکر کیا ہے،(۲) پھر مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے اپنی اور اپنے رفقاء رضی اللہ عنہم کی رہائش گاہ کے لئے فکر کرنے سے پہلے مسجد کی فکر فرمائی اور جس مکان کو آپ کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل تھا، اسی کے سامنے ایک زمین خرید کر مسجد نبوی ﷺ کی بنیاد رکھی۔

قرآن مجید میں

• ان مساجد کی خصوصی حیثیت ہے، کیوں کہ کسی زمین کو مسجد کے لئے وقف کرنا، اس حصہ

زمین کو براہ راست اللہ کے حوالہ کر دینا ہے، اب گویا وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے،

(۱) دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۹، باب فی المواضع التی لاتجوز فیھا الصلاۃ (۲) توبہ: ۱۰۸

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَداً۔(۱)

بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں، اس لئے (مسجدوں میں)
اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

اس آیت میں اولاً تو تاکید اور قوت کے لئے ''أن '' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو عربی قواعد کے مطابق قوت و تاکید کے معنی کے لئے ہے، پھر مسجد کے بجائے ''مساجد'' یعنی واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اور اس پر جو ''الف، لام'' آیا ہے، وہ عربی گرامر کی رو سے ''استغراق'' کے معنی میں ہے، اس طرح اب اس کے معنی ''تمام مسجدوں'' کے ہو گئے، یعنی جو حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ کسی ایک مسجد کا نہیں ہے؛ بلکہ تمام ہی مسجدوں کا ہے، اسی لئے مشہور مفسر عکرمہؒ نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت تمام ہی مسجدوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، (۲) پھر فرمایا گیا ''للہ''، عربی گرامر کی رو سے ''ل'' ملکیت اور اختصاص کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے، یعنی مسجدیں اللہ ہی کی ملکیت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، آگے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرما دی کہ مسجد کے اللہ کی ملکیت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ —— اور وہ یہ کہ یہ جگہ ہمیشہ کے لئے اللہ کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، لہٰذا اس مخصوص حصہ زمین میں غیر اللہ کی عبادت کی اجازت نہیں دی جا سکتی فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَداً، (۳) کیوں کہ ''ف'' تفسیر و وضاحت کے لئے آیا کرتا ہے، پس مسجد پر اللہ کی ملکیت کا مسأ و مقصود واضح ہو گیا کہ یہاں صرف اللہ ہی کی عبادت کی جا سکتی ہے، چنانچہ تفسیر ثعالبی میں اس ٹکڑے کی وضاحت کرتے

ہوئے لکھا گیا ہے :

... فيصلح أن تفرد للعبادة وكل ماهو خالص الله

(١) الجن:١٨ (٢) مختصر تفسیر ابن کثیر:٣/٥٨٦ (٣) الجن:١٨

تعالی... ولا يجعل فيها لغير الله نصيب۔(١)

مسجدوں کی شان یہ ہے کہ ان کو عبادت اور ایسے ہی کاموں کے لئے مخصوص رکھا جائے، جو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہیں اور ان میں اللہ کے علاوہ کسی کا کوئی حصہ نہ ہو۔

اسی طرح کی بات علامہ زمخشریؒ نے بھی لکھی ہے،(٢) پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ "أَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ" (بے شک مسجدیں اللہ ہی کے لئے ہیں) عربی قواعد کے اعتبار سے جملہ اسمیہ ہے، اور جملہ اسمیہ میں ثبوت واستمرار اور بقاء ودوام کی کیفیت پائی جاتی ہے، ان تفصیلات سے جو بات منقح ہو کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے :

دنیا کی تمام وہ جگہیں جہاں مسجد بنادی گئی ہو اور جنھیں مالکانِ زمین نے نماز پڑھنے کے لئے مخصوص کر دیا ہو، براہ راست اللہ کی ملکیت ہیں، اور اللہ ہی کی عبادت کے لئے مخصوص ہیں، اور اس میں غیر اللہ کی عبادت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

- اسی طرح ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ۔(٣)

مشرکین کے لئے درست نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔

یہاں مساجد کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے، عربی قواعد کے اعتبار سے یہ نسبت

واضافت ملکیت کے رشتہ کو ظاہر کرتی ہے، جیسے کہا جائے، "بیت رشید" (رشید کا گھر)، اس کے

معنی یہ ہیں کہ رشید اس گھر کا مالک ہے، یا کہا جائے ''قلم حمید'' (حمید کا قلم) تو معنی یہ ہوئے کہ قلم

(۱) تفسیر الثعالبی:۵/۴۹۷ (۲) دیکھئے:الکشاف:۴/۶۳

(۳) التوبہ:۱۷

حمید کی ملکیت ہے، اسی طرح نماز پڑھنے کی مخصوص جگہ، ''مسجدیں'' اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہیں گی، کیوں کہ مالک جب تک اپنی ملکیت سے کسی چیز کو نکال نہ دے، اس سے اس کی ملکیت کا رشتہ منقطع نہیں ہوسکتا، پھر اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق تمام مسجدوں سے ہے کہ کوئی بھی مسجد مشرکین کے حوالہ نہیں کی جاسکتی، چنانچہ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں :

الظاهر أن المراد شيئاً من المساجد لأنه جمع مضاف فيعم ويدخل فيه المسجد الحرام دخولاً أوّلياً۔(۱)

ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی بھی مسجد ہے، اس لئے کہ یہ جمع ہے جسے اللہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے، لہٰذا یہ تمام مسجدوں کو شامل ہوگا، اور مسجد حرام اس میں اولین طور پر داخل ہوگی

۔

● اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔(۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روک دے، اور اس کو ویران کرنے کے درپے ہو؟

۔

اس آیت میں بھی مساجد کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے، اور جو جگہ اللہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہو، اس میں اللہ کی عبادت کے روک دینے کو بہت بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے، یہ آیت گو مسجد حرام سے متعلق نازل ہوئی ہے، لیکن جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جس میں اس بات کی

(۱) روح المعانی: ۴/ ۹۴
(۲) البقرہ: ۱۱۴

طرف اشارہ ہے کہ تمام مسجدوں کا یہی حکم ہے، المراد سائر المساجد (۱) —— اسی لئے مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ گو یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، لیکن یہ حکم عام ہے، ...... الحکم عام و إن کان المورد خاصاً (۲) —— اور مسجد کو ویران کرنے سے مراد اس کو منہدم کرنا اور اس میں عبادت کو معطل کر دینا ہے۔ (۳)

اس آیت کے آئینہ میں وہ لوگ اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں جو بابری مسجد سے دستبردار ہو جانے کی بات کرتے ہیں، کہ قرآن کی زبان میں مسجد کو عبادت الٰہی سے محروم کر دینا سب سے بڑا ظلم ہے، اور اگر ہم کسی گروہ سے اس بات کا معاہدہ کرلیں کہ مسجد کو مشرکانہ عبادت گاہ بنا دیا جائے تو یہ یقیناً مسجد کو ویران اور معطل کرنے میں تعاون کرنا ہے۔

احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

مسجد کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بھی روشنی ملتی ہے، اس سلسلہ میں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں :

- عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال ، قال رسول اللہ ﷺ : إن بیوت اللہ فی الأرض المساجد و إنّ حقاً علی اللہ أن یکرم الزائر ۔ (۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین میں مسجد یں اللہ کے گھر ہیں اور یہ
بات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، کہ جو اللہ کے گھر کی زیارت
کرے، اللہ تعالیٰ اس کا اکرام فرمائے۔

(۱) تفسیر قرطبی: ۲/ ۵۳، نیز دیکھئے: تفسیر طبری: ۱/ ۳۵۲ (۲) تفسیر مظہری: ۱/ ۱۱۶
(۳) تفسیر أبی السعود: ۱/ ۱۴۹
(۴) مجمع الزوائد بحوالہ معجم طبرانی کبیر، کتاب الصلاہ، باب لزوم المساجد، حدیث نمبر: ۲۰۲۸

اس حدیث میں مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کا گھر قرار دیا گیا ہے، گھر قرار دینے کا مطلب ظاہر ہے کہ مسجد یں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب انسان اس کا مالک باقی نہیں رہا، تو اس کو اس میں کسی تصرف اور اس کی حیثیت اور کیفیت کو بدلنے کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

● عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال: من بنی للہ مسجداً، بنی اللہ لہ بیتاً أوسع منہ فی الجنۃ۔(۱)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اس سے زیادہ کشادہ گھر بنائیں گے۔

اس حدیث میں مسجد کی تعمیر کو اللہ تعالیٰ کا گھر قرار دینے کے علاوہ ایک ایسی عمارت اور جگہ قرار دیا گیا ہے، جو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے، اس سے بھی اسی مضمون کی تاکید ہوتی ہے، جو اوپر گذرا کہ مسجد انسان کی ملکیت سے نکل کر براہ راست اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے۔

● عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ أن رجلاً سأل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أیّ البقاع خیر، وأیّ البقاع شر؟ قال:

خیر البقاع المساجد وشر البقاع الأسواق۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے
رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کون سا خطہ سب سے بہتر ہے
اور کون سا خطہ سب سے بدتر ؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
سب

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۷۰۵۶
(۲) مجمع الزوائد، بحوالہ طبرانی فی الکبیر، باب فضل المساجد الخ، حدیث نمبر: ۱۹۲۷

سے بہتر خطہ مسجدیں ہیں اور سب سے بدتر خطہ بازار ہیں۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

- خیر البقاع بیوت اللہ فی الأرض ۔(۱)

زمین میں سب سے بہتر حصہ اللہ کے گھر (مسجدیں) ہیں۔

ان احادیث میں زمین کے اس حصہ سے بہتر ہونے کو منسوب کیا گیا ہے، جو مسجد ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد تعمیر کردی جاتی ہے، یا جو حصہ زمین مسجد کے لئے وقف کردیا جاتا ہے، اس کی اللہ تعالیٰ سے نسبت قائم ہوجاتی ہے اور اس کی ایک خاص حیثیت بن جاتی ہے، نیز مسجدیت در و دیوار سے متعلق نہیں ہوتی، بلکہ اس زمین سے متعلق ہوتی ہے، جس کو مسجد کی حیثیت سے وقف کیا گیا ہو۔

- عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ألمساجد بیوت اللہ فی الأرض تضیئ لأھل السماء کما تضیئ نجوم السماء لأھل الأرض ۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے

فرمایا: مسجدیں زمین میں اللہ کا گھر ہیں، آسمان والوں کے لئے وہ ایسے ہی روشن ہوتی ہیں، جیسے زمین والوں کے لئے آسمان کے تارے۔

اس روایت میں بھی مسجدوں کو اللہ کا گھر قرار دیا گیا ہے اور ان کو تاروں سے تشبیہ دی گئی

(۱) مجمع الزوائد، بحوالہ معجم اوسط للطبرانی، حدیث نمبر: ۱۹۲۶

(۲) مجمع الزوائد، بحوالہ معجم طبرانی کبیر، حدیث نمبر: ۱۹۳۴

ہے، جیسے تارے ہمیشہ روشن رہتے ہیں، اسی طرح گویا یہ زمین بھی ہمیشہ روشن رہے گی اور ان کی حیثیت مسجد کی بنی رہے گی۔

- عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال: قال رسول اللہ ﷺ تذهب الأرضون كلها يوم القيامة إلا المساجد فإنها يضم بعضها إلى بعض۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تمام زمینیں ختم ہوجائیں گی، سوائے مسجدوں کے، کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوجائیں گی۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ مسجدیں قیامت تک مسجد ہی کی حیثیت سے باقی رہیں گی، یہاں تک کہ قیامت میں بھی باقی رکھی جائیں گی۔

ایک شبہ

علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ نے عبداللہ الیشکری کی روایت سے استدلال کیا ہے، کہ کوفہ میں پہلے مسجد کھجور کے بازار میں تھی اور بعد میں وہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر منتقل کردی گئی،

چنانچہ عبداللہ الیشکری سے مروی ہے :

دخلت المسجد الکوفہ أول مابنی مسجدھا وھو فی أصحاب التمر یومئذ۔(۲)

لیکن یہ استدلال کئی وجوہ سے محل نظر ہے۔

(۱) مجمع الزوائد، بحوالہ طبرانی، حدیث نمبر:۱۹۳۰

(۲) مسند احمد عن عبداللہ الیشکری: ۳/ ۴۷۲، حدیث نمبر: ۱۵۸۶۳، جلد:۶/ ۲۸۳، حدیث نمبر: ۲۷۱۴۶-۲۷۱۴۷

۱- مسند احمد میں کئی جگہ یہ حدیث آئی ہے، بعض روایتوں میں ''مسجد'' کا ذکر ہے، اور بعض میں نہیں، ''وکیع عن عمرو بن حسان'' میں ذکر آیا ہے، لیکن عمرو بن حسان نسبۃً کم درجہ کے راوی ہیں، (۱) ''عفان عن ہمام'' میں بھی ذکر آیا ہے، لیکن اسی میں ایک راوی محمد بن جحادہ ہیں، جن کو گو بعض حضرات نے ثقہ قرار دیا ہے، لیکن ابوعوانہ کا بیان ہے: کان یغلو فی التشیع۔(۲)

''ابوقطن عن یونس'' والی سند میں بھی ''مسجد'' کا ذکر ہے؛ لیکن ''وکیع عن یونس'' (حدیث نمبر:۱۵۹۷۹) اور ''عبدالرزاق عن ابی اسحاق'' (حدیث نمبر:۱۵۹۸۰) میں ''مسجد'' کا ذکر نہیں ہے، (۳) حالاں کہ یہ رواۃ زیادہ قوی ہیں۔

۲- اس روایت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصلحت کی وجہ سے دوسری جگہ مسجد تعمیر کر دی گئی اور لوگ وہاں نماز پڑھنے لگے، یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ پہلی جگہ کو مسجد کے بجائے کسی اور کام کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہو، اگر آبادی کے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جانے کی وجہ سے دوسری جگہ مسجد تعمیر کی جائے اور لوگ وہاں نماز پڑھنے لگیں تو اس کے درست ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ پہلے سے جو جگہ مسجد تھی اس کی حیثیت بدلی نہیں جا سکتی

اور وہ ابھی بھی مالکانہ تصرفات اور احترام و ادب کے اعتبار سے مسجد ہی باقی رہے گی۔

۳- علامہ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کو منتقل کرنے کا حکم نہیں دیا

تھا، بلکہ چوں کہ کوفہ کے بیت المال میں چوری ہوگئی تھی؛ اس لئے مسجد کی سمت قبلہ میں بیت المال بنانے کا حکم فرمایا تھا،(۴) تا کہ مسجد میں لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے بیت المال نظر میں رہے، اور اس طرح کے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔

۴- اس میں مسجد سے مسجدِ شرعی ہی مراد ہو، یہ بھی ضروری نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ

(۱) دیکھئے: تعجیل المنفعة: ۳۴۰، کتاب الجرح و التعدیل لابن ابی حاتم: ۶ / ۲۲۷
(۲) تہذیب التہذیب: ۷ / ۸۳-۸۴ (۳) دیکھئے: مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۵۹۷۹-۱۵۹۸۰
(۴) فتح القدیر: ۵ / ۴۴۶

لوگ بازار میں کسی جگہ کو نماز کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں، اس کی حیثیت مسجد شرعی کی نہیں ہوتی بلکہ عبادت گاہ اور مسجد بیت کی ہوتی ہے، اور روایت میں جو ''ھو فی اصحاب التمر'' کی تعبیر ہے، اس سے بھی اس احتمال کو تقویت پہنچتی ہے۔

۵- کتاب و سنت کی جو نصوص اوپر ذکر کی گئی ہیں، ان کے مقابلہ میں یہ عمل صحابی (جس کا درجہ بہر حال کتاب و سنت کے بعد ہی ہے) قابل توجہ نظر نہیں آتا اور پھر چوں کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں فی الجملہ اجتہاد کی گنجائش ہے، اس لئے یہ صحابی کی شخصی رائے بھی ہوسکتی ہے۔

قیاس

• جہاں یہ بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے، وہیں یہ قیاس کا بھی تقاضا ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں بھی اور احادیث میں بھی تین اہم مساجد (جو انبیاء کرام سے منسوب ہیں اور اسلام کے اہم ترین مقامات مقدسہ میں سے ہیں) مسجد حرام (مکہ مکرمہ)، مسجد نبوی ﷺ (مدینہ منورہ) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کو مسجد ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں مسجد حرام کا ذکر ۱۵ / مواقع پر کیا گیا ہے:

البقرہ: ۱۴۴، البقرہ: ۱۴۹، البقرہ: ۱۵۰

البقرہ :۱۹۱، البقرہ :۱۹۶، البقرہ : ۲۱۷

المائدہ: ۲ ، الانفال: ۳۴، التوبہ : ۷

التوبہ :۱۹، التوبہ: ۲۸ ، الإسراء: ۱

الحج :۲۵، الفتح :۲۵ ، الفتح : ۲۷

مسجد اقصیٰ کا ذکر ایک جگہ آیا ہے (۱)، مسجد نبوی ﷺ کا صریح ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، لیکن سورہ توبہ کی آیت نمبر: ۱۰۸، بعض مفسرین کے نزدیک مسجد نبوی ﷺ سے متعلق ہے، اگر یہ بات

(۱) الإسراء:۱

مان لی جائے ،تو قرآن مجید میں اسے بھی مسجد ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیثیں بے شمار ہیں جن میں ان تینوں مقامات مقدسہ کے لئے مسجد کا لفظ آیا ہے اور وہ حدیث تو خاص طور پر مشہور ہے ،جس میں فرمایا گیا کہ مساجد میں سے ان ہی تین مساجد کے لئے طویل سفر کیا جا سکتا ہے :

لا تشد الرحال إلا إلی ثلاثة مساجد ، الکعبة
و مسجدی ھذا و مسجد الأقصیٰ ۔(۱)

اسی طرح وہ حدیث جس میں ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خصوصی فضیلت کا بیان ہے اور جو حدیث کی مختلف کتابوں میں وارد ہوئی ہے، اس میں بھی ان تینوں مساجد کو بحیثیت مسجد ذکر فرمایا گیا ہے، اب قابل غور بات یہ ہے کہ ان مقامات مقدسہ کا اصل وجہ امتیاز اور اس کی اصل شناخت اور پہچان ان کا ''مسجد ہونا'' ہے، لہٰذا بحیثیت مسجد جو احکام ان مقامات کے ہوں گے ، وہی دوسری مساجد کے بھی ہوں گے ،تو اگر ان مساجد کی حیثیت دوامی ہے تو یہی حیثیت روئے ارض کی تمام مساجد کی ہوگی ، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ جس مقام پر ''مسجد شرعی'' بن جائے ،اس کی حیثیت ہمیشہ مسجد ہی کی رہے گی۔

مسجدِ بیت

یہاں ایک بات کی وضاحت مناسب محسوس ہوتی ہے کہ یہ سارے احکام مسجد شرعی کے ہیں، یعنی اس جگہ کے جس کو مسجد کے لئے وقف کر دیا گیا ہو، ورنہ حدیث میں ''مسجدِ بیت'' یعنی گھر میں نماز پڑھنے کے لئے مخصوص جگہ کا بھی ذکر ملتا ہے، کہ جیسے آدمی گھر میں کھانے، پینے اور دوسری ضروریات کے لئے کوئی جگہ مخصوص رکھتا ہے، اسی طرح کوئی جگہ نماز کے لئے بھی مخصوص رکھی جائے اور اس کو صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام کیا جائے، اس سلسلہ میں متعدد روایتیں ملتی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ گھروں

(۱) سنن دارمی، حدیث نمبر: ۱۴۲۸

میں نماز گاہ (مسجد) بنالیں اور اسے صاف ستھرا رکھیں (۱)، اسی مضمون کی روایت بیہقی میں حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اپنے گھروں میں نماز کی جگہ بنائیں اور اس کو بہتر طور پر بنائیں اور صاف ستھرا رکھیں (۲)، علامہ ہیثمیؒ نے صراحت کی ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (۳)، ان کی حیثیت چوں کہ مسجد شرعی کی نہیں ہے اور انھیں نماز کے لئے وقف نہیں کیا گیا ہے ؛ اس لئے ان عارضی جگہوں کا حکم وہ نہیں ہوگا، جو مسجدوں کا ہے، البتہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ کو صاف ستھرا رکھا جائے، تاکہ بے تکلف نماز ادا کی جا سکے، فقہاء کے یہاں بھی ایسی مسجد کا ''مسجد البیت'' (مسجد خانہ) کی حیثیت سے ذکر ملتا ہے (۴)۔

سوادِ اعظم کا نقطۂ نظر

مسجد کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں فقہاء کا بھی قریب قریب اتفاق ہے کہ جو جگہ مسجد بن جائے وہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہے، اور اس کی حیثیت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اس وقت اُمت

مسلمہ میں جن دبستانہائے فقہ کی پیروی کی جاتی ہے، اور جن کی حیثیت اُمت کے سوادِ اعظم کی ہے، وہ حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ ہیں، اور رسول اللہ ﷺ نے ''سوادِ اعظم'' کی اتباع کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے :

علیکم بالسوادِ الاعظم۔(۵)

تم پر سوادِ اعظم کی پیروی واجب ہے۔

''سوادِ اعظم'' سے مسلمانوں کا اجماع واتفاق مراد نہیں، بلکہ غالب اکثریت مراد ہے :

(۱) سنن بیهقی، باب فی تنظیف المساجد الخ، حدیث نمبر:۴۳۰۸
(۲) مسند احمد، حدیث نمبر:۱۹۶۳، عن عروہ بن زبیر
(۳) مجمع الزوائد، باب اتخاذ المساجد فی الدور الخ (۴) الدر المختار مع الرد:۲/۴۲۹
(۵) مسند احمد:۴/۲۷۸، حدیث نمبر:۱۸۴۰۹، ۴/۳۷۵، حدیث نمبر:۱۹۲۹۹، ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۹۵۰

يعبر به عن الجماعة الكثيرة والمراد ماعليه أكثر المسلمين۔(۱)

حنفیہ

حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسجد کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی، خواہ مسجد ویران کیوں نہ ہوجائے :

ولو جعل داره مسجداً فخرب جوار المسجد أو استغنىٰ عنه لايعود إلى ملكه ويكون مسجداً أبداً عند ابى يوسف علیہ الرحمۃ وعند محمد علیہ الرحمۃ يعود إلى ملكه۔ (۲)

اگر کوئی شخص اپنے گھر کو مسجد بنالے اور مسجد کے گرد وپیش کا

حصہ ویران ہوجائے ، یا مسجد کی ضرورت باقی نہیں رہے،
تب بھی وہ (جگہ) واقف کی ملکیت میں نہیں لوٹے گی ،اور
ہمیشہ کے لئے مسجد رہے گی ، یہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے
اور امام محمدؒ کے نزدیک واقف کی ملکیت میں لوٹ آئے گی۔

اور حنفیہؒ کے یہاں اسی پر فتویٰ ہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ رقمطراز ہیں :

ولو خرب ماحوله وأستغنى عنه يبقى عند الإمام
والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتى ، حاوى
القدسي ... إن الفتوىٰ على أن المسجد لايعود
ميراثاًولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر۔(۳)

(۱) مرقاۃ المصابیح:۱/۲۴۹
(۲) بدائع الصنائع:۵/۳۳۰،حکم الوقف الجائز ومايتصل به
(۳) الدر المختار مع الرد:۶/۵۴۸۰-۵۴۹

اگر مسجد کا گرد و پیش ویران ہوجائے اور مسجد کی ضرورت
باقی نہیں رہے، تب بھی وہ ہمیشہ قیامت تک امام ابوحنیفہؒ
اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسجد ہی باقی رہے گی اور اسی
پر فتویٰ دیا جاتا ہے ......فتویٰ اس بات پر ہے کہ مسجد
میراث نہیں بنے گی ، نہ اس کی منتقلی جائز ہوگی اور نہ اس کا
مال دوسری مسجد کو لگانا درست ہوگا۔

فقہ حنفی کے مشہور ترجمان علامہ ابن نجیم مصریؒ ’’خلاصۃ الفتاویٰ‘‘ اور’’فتاویٰ نسفی‘‘ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

بيع عقار المسجد لمصلحة المسجد لايجوز وإن

كان بأمر القاضي وإن كان خراباً۔(۱)

مصلحت مسجد کے لئے بھی خاص مسجد کی زمین کوفروخت کرنا جائز نہیں، گوقاضی کے حکم سے ہواور چاہے ویران ہو۔

امام محمدؒ کی رائے ـــ ایک جائزہ

اس میں شبہ نہیں کہ فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر مسجد ویران ہو جائے اور وہاں مسلمان بالکل باقی نہ رہیں، تو وہ جگہ وقف کرنے والے کی ملکیت میں لوٹ آئے گی، لیکن اس نقطۂ نظر کو جولوگ بابری مسجد کے قضیہ میں بنیاد بنانا چاہتے ہیں، انھیں ان نکات کو پیش نظر رکھنا چاہئے :

◂ کسی بھی مسلک و مذہب میں اس کا مستند و معتبر قول ہی قابل عمل ہوتا ہے، اوراس مسئلہ میں امام محمدؒ کے قول کے مقبول نہ ہونے پر تمام ہی فقہاء متفق اور یک زبان ہیں، اس لئے

(۱) البحر الرائق:۵/ ۲۲۳

اس سے استدلال درست نہیں۔

◂ امام محمدؒ کی یہ رائے محض قیاس پر مبنی ہے کہ وہ جگہ نماز پڑھنے کے لئے وقف کی گئی تھی اوراب وہاں مسجد کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی؛ اس لئے اب اسے وقف کرنے والے کی ملکیت میں لوٹ آنا چاہئے ، ان کے نقطۂ نظر پر قرآن و حدیث کی کوئی صریح یا مبہم دلیل موجود نہیں ، اورامام ابوحنیفہؒ وامام ابویوسفؒ کے نقطۂ نظر پر قرآنی آیات اوراحادیث شاہد ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان حضرات کی رائے ہی قابل قبول ہوسکتی ہے۔

◂ امام محمدؒ کے نزدیک بھی اس کی موقوفہ حیثیت کے ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ اس وقف کے بانی کے وارثوں کی طرف لوٹ آئے گی :

وعاد الى الملك أى ملك البانى أو ورثته عند

محمد علیہ الرحمۃ۔(۱)

(ویران مسجد) ملک میں لوٹ آئے گی، یعنی وقف کرنے والے، یا اس کے ورثہ کی ملک میں۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ موقوفہ شئ (مسجد) کی حیثیت کو ان کے نزدیک بھی اسی وقت تبدیل کیا جا سکتا ہے، جب کہ اصل واقف یا اس کے ورثاء موجود ہوں؛ کیوں کہ ان کو اس خطہ زمین کے بارے میں وقف کنندہ ہونے کی بنیاد پر ایک ترجیحی حیثیت حاصل ہوتی ہے، دوسرے لوگوں کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی اور بابری مسجد کا مسئلہ یہ نہیں ہے؛ کیوں کہ نہ وقف کنندہ موجود ہے اور نہ ان کے ورثہ معلوم و متعین۔

◄ اگر بالفرض وقف بورڈ کو وقف کنندہ کا قائم مقام تسلیم کر لیا جائے، تب بھی امام محمدؒ کے نزدیک یہ بات اس وقت جائز ہے، جب وہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہو، اور مسجد میں مسلم

(۱) در مختار مع الرد: ۶/ ۵۴۸

آبادی نہ ہونے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی جا سکتی ہو، لیکن ایودھیا کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے، ایودھیا میں اچھی خاصی مسلم آبادی موجود ہے، اور جس شب بابری مسجد میں مورتی بیٹھائی گئی، اس شب تک بھی مسجد میں نماز ہوتی رہی ہے، اس لئے یہ وہ صورتِ حال نہیں ہے، جس میں امام محمدؒ نے مسجد کی حیثیت کے ختم ہونے کے بارے میں کہا ہے۔

◄ امام محمدؒ کے نزدیک جو مسجد ویران اور نا قابل استعمال ہو جائے وہ وقف کرنے والے مسلمان یا اس کے ورثہ کی ملکیت میں لوٹ آتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کوئی مسلمان مالکِ زمین کیا اپنی زمین اس مقصد کے لئے دے سکتا ہے کہ اسے شرک و بت پرستی کی آماجگاہ بنایا جائے، کیا یہ کفر و شرک میں تعاون نہیں ہوگا؟ اور کیا اس طرح کا تعاون درست ہوگا؟ اگر افراد و اشخاص کے لئے اس کا ارتکاب درست نہیں، تو اجتماعی حیثیت میں پوری اُمت کے لئے یہ بات کیسے

درست ہوسکتی ہے؟

مالکیہ

مالکی دبستانِ فقہ میں بھی مسجد کی حیثیت قیامت تک مسجد کی ہوتی ہے، نہ اس کی فروخت ہوسکتی ہے اور نہ کوئی اور صورت، چاہے وہ جگہ ویران کیوں نہ ہوگئی ہو، چنانچہ وزارتِ اوقاف کویت کی مطبوعہ مشہورِ عالَم فقہی انسا ئیکلو پیڈیا (الموسوعة الفقهية) میں مالکیہ کا مسلک ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

أما المسجد فلا خلاف فی عدم جواز بیعه مطلقاً سواء خرب أم لا ۔(۱)

مسجد کو بیچنا مطلقاً جائز نہیں، خواہ ویران ہوگئی ہو یا نہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۱) الموسوعة الفقهيه: ۷ / ۲۲۳، اسبتدال المسجد

بلکہ فقہاء مالکیہ کے یہاں تو دوسرے اوقاف کے سلسلہ میں بھی یہی اُصول ہے، کہ موقوفہ زمین کو ہمیشہ اسی حیثیت سے باقی رکھا جائے، چنانچہ علامہ دردیر مالکیؒ لکھتے ہیں :

لایباع عقار حبس أی لایجوز بیعه ولایصح وإن خرب (بکسر الراء) وصار لاینفع به وسواء کان داراً أو حوانیت أو غیرها ۔(۱)

وقف کی زمین نہیں بیچی جاسکتی، یعنی اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، (اور اگر کر بھی لی جائے تو) درست نہیں، گو ویران ہو اور اس حال میں آگئی ہو کہ اس سے نفع نہیں اُٹھایا جاسکتا

ہو، چاہے تعمیری احاطہ ہو، یا دکانیں یا کچھ اور۔

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ مالکی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ سخت ہے اور ان کے نزدیک مسجد تو کجا دوسرے اوقاف کی حیثیت بھی گویا دائمی ہوتی ہے اور مسجد تو ہمیشہ کے لئے مسجد ہے ہی۔

شوافع

فقہاء شوافع کے نزدیک بھی مسجد کی جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہو جاتی ہے، گو مسجد ویران ہوگئی ہو اور گو اس کی عمارت منہدم ہو کر رہ گئی ہو، چنانچہ معروف شافعی فقیہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں :

أما المسجد فإنه إذا انهدم وتعذرت إعادته فإنه لايباع بحال لإمكان الإنتفاع به حالا بالصلوٰة فی أرضه۔(۲)

جب مسجد منہدم ہو جائے اور اس کو دوبارہ بنانا دشوار ہو جب

(۱) الشرح الصغیر: ۴/۱۲۶ (۲) شرح مہذب: ۱۵/۳۶۱

بھی اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اس زمین میں نماز کی ادائیگی کے ذریعہ فی الحال بھی اس سے نفع اُٹھانا ممکن ہے۔

اس سے بھی زیادہ واضح اور صریح نوویؒ کی یہ عبارت ہے :

وإن وقف مسجداً فخرب المکان وانقطعت الصلوٰة فیه لم یعد إلی الملک ولم یجز التصرف فیه۔(۱)

اگر مسجد وقف کی، وہ جگہ ویران ہوگئی وراس میں نماز کا سلسلہ

ختم ہوگیا تو وہ زمین مالک کی ملکیت میں نہیں لوٹے گی اور نہ اس میں اس کا تصرف جائز ہوگا۔

فقہ شافعیؒ کی نہایت مستند کتاب ''روضۃ الطالبین''میں ہے :

لو انهدم المسجد أو خربت المحلة حوله وتفرق الناس عنها فتعطل المسجد لم يعد ملكاً بحال ولايجوز بيعه لإمكان عوده كما كان ولأنه في الحال يمكن الصلاة فيه ۔(۲)

اگر مسجد منہدم ہوجائے یا اس کے گرد و پیش کا محلہ ویران ہوجائے اور لوگ وہاں سے چلے جائیں، چنانچہ مسجد معطل ہوجائے، تو اس پر ملکیت لوٹے گی نہیں، اور اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ آئندہ پھر وہ مسجد بن سکتی ہے، اور اس

(۱) شرح مہذب:۱۵/ ۳۶۰

(۲) روضۃ الطالبین:۵/ ۳۵۷

لئے بھی کہ فی الحال اس زمین پر تو نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

''حاشیہ اعانۃ الطالبین''میں لکھا ہے کہ اس کی کھلی زمین پر اعتکاف بھی کیا جاسکتا ہے،(۱) — نیز ''فتح المعین''(اعانۃ الطالبین جس کا حاشیہ ہے) میں لکھا ہے کہ یہ مسجد ہی کے حکم میں اس لئے باقی رہے گی کہ اس زمین میں نماز پڑھنا اور اعتکاف کرنا ممکن ہے، لإمكان الصلاة والاعتكاف في أرضه ۔(۲)

''زادالمحتاج''میں ہے :

ولو إنهدم مسجد وتعذرت إعادته لم يبع بحال ۔(۳)

اگر مسجد منہدم ہوجائے اور اس ملبہ کو دوبارہ مسجد میں شامل کرنا

ممکن نہ ہو، تب بھی اسے فروخت نہ کیا جائے۔

گویا مسجد کی زمین ہی نہیں، بلکہ فقہاء شوافع کے نزدیک اس کا ملبہ بھی فروخت اور منتقل نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ بعض فقہاء شوافع نے اس کی اجازت دی ہے کہ اگر اسی مسجد میں دوبارہ اس کا استعمال متوقع نہ ہو تو حاکم کسی اور مسجد کی تعمیر میں اس ملبہ کو استعمال کرسکتا ہے، وبنی الحاکم بنقضه مسجداً آخر (۴) —— یہ تمام کتابیں جن کا ذکر کیا گیا، فقہ شافعیؒ کی مستند ترین کتابیں ہیں اور ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ مسجد کی دائمی حیثیت کو بیان کیا گیا ہے۔

حنابلہ

فقہ حنبلی میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور خود امام احمد بن حنبل کی طرف متضاد رائیں منسوب ہیں، ایک یہ کہ مسجد اپنی جگہ سے منتقل نہیں کی جاسکتی؛ البتہ اگر مسجد ناقابل استعمال ہو جائے

(۱) اعانۃ الطالبین: ۱۷۹/۳ (۲) فتح المعین: ۱۷۹/۳
(۳) زاد المحتاج: ۴۳۰/۲
(۴) شرح المنہاج: ۴۳۱/۲

تو اس کا ملبہ اور اس کے آلات منتقل کئے جاسکتے ہیں، انھیں بیچ کر اس کی قیمت اسی مسجد کی تعمیر میں بھی لگائی جاسکتی ہے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو کسی اور مسجد میں استعمال کرلیا جائے، چنانچہ فقہ حنبلی کی معروف کتاب ''الانصاف'' میں ہے:

وعنه لا تباع المساجد لكن تنقل آلتها إلى مسجد آخر ويجوز بيع بعض آلته وصرفها في عمارته۔(۱)

امام احمدؒ سے مروی ہے کہ مسجدیں بیچی نہیں جاسکتیں؛ البتہ اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کیا جاسکتا ہے، نیز ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بعض سامان فروخت کردیے جائیں اور اسے

اسی مسجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔

بعینہ یہی الفاظ محمد بن قدامہ مقدسی نے لکھے ہیں (۲)، نیز علامہ مقدسی ہی رقم طراز ہیں :

لاتباع المساجد لکن تنقل آلتها إلی مسجد آخر۔
(۳)

مسجدیں بیچی نہیں جائیں گی؛ لیکن اس کا سامان دوسری مسجد کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔

نیز فقہ حنبلی کے یہی معروف ترجمان ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :

إن المساجد لاتباع وإنما تنقل آلاتها۔ (۴)

مسجدیں فروخت نہیں کی جائیں گی ؛ البتہ اس کے آلات منتقل کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) الانصاف علی هامش المقنع: ۱۶/ ۵۲۲ (۲) دیکھئے: المقنع: ۱۶/ ۵۲۵
(۳) الشرح الکبیر: ۱۶/ ۵۲۱ (۴) المغنی: ۵/ ۳۶۷

اس طرح کی صراحتیں فقہ حنبلی کی دوسری کتابوں میں بھی ملتی ہیں، اس کے مقابلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ اگر مسجد کی منفعت ختم ہوجائے، تو مسجد کو فروخت کیا جاسکتا ہے اور اس کی قیمت دوسری مسجد میں لگائی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں چند صراحتیں نقل کردینا مناسب بھی ہے اور علمی دیانت کا تقاضا بھی :

ولایجوز بیعه إلا أن تتعطل منافعه فیباع ویصرف ثمنه فی مثله۔ (۱)

مسجد کو فروخت کرنا جائز نہیں، سوائے اس کے کہ اس کے منافع ختم ہو گئے ہوں، کہ اس صورت میں اسے فروخت کیا

جاسکتا ہے۔

فإن تعطلت منافعه بالكلية كدار إنهدمت ...
أو مسجد إنتقل أهل القرية عنه ... جاز بيع البعض
وإن لم يمكن الإنتفاع بشئ منه بيع جميعه۔(۲)

اگر اس کے منافع بالکلیہ ختم ہو گئے، جیسے کوئی مکان تھا، منہدم ہو گیا، ...... یا مسجد تھی اور اس آبادی کے مسلمان وہاں سے منتقل ہو گئے، ......تو اگر یہ ممکن ہو کہ اس کا کچھ حصہ بیچ کر بقیہ کی تعمیر کی جائے، تو کچھ حصہ کو فروخت کرنا جائز ہوگا، اور اگر اس سے بالکل ہی نفع اُٹھانا ممکن نہ ہو تو اس پورے کو بیچا جاسکتا ہے۔

(۱) الانصاف:۱۶/ ۵۲۲ (۲) الشرح الکبیر:۱۶/ ۵۲۲

حنبلی مسلک — کچھ وضاحتیں

اس طرح کی بعض اور عبارتیں بھی فقہ حنبلی کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں :

- امام احمدؒ کا جو قول مسجد کی منتقلی کے ناجائز ہونے کا ہے، وہ کتاب وسنت کی نصوص سے زیادہ ہم آہنگ ہے؛ اس لئے اسے ترجیح ہوگی۔
- امام احمدؒ کا یہ قول تفردات میں سے ہے، خود فقہاءِ حنابلہ نے بھی لکھا ہے: هو من المفردات(۱)، اور یہ قول جمہور اور اکثر اہل علم کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، چنانچہ ''الموسوعة الفقهيه'' میں ہے کہ جمہور فقہاء اسی طرف گئے ہیں کہ اصل مسجد کی جگہ تبدیل نہیں کی جاسکتی ہے :

ذهب جمهور الفقهاء إلى عدم جواز إستبدال المسجد۔(۲)

اور اُصول یہی ہے کہ جو قول شاذ کے درجہ میں ہو اور نوادر اور تفردات میں سے ہو، اسے قبول نہیں کیا جاتا، ورنہ اگر مختلف فقہاء کے شاذ اقوال کو جمع کرلیا جائے تو اس سے گمراہی کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

◄ امام احمدؒ کے یہاں بھی یہ گنجائش اس وقت —— ایک قول کے مطابق —— ہے جب کہ مسجد کی جگہ نا قابل استعمال ہوجائے اور لوگ وہاں سے چلے جائیں، لیکن بابری مسجد کا مسئلہ ایسا نہیں ہے، یہ ایک آباد شہر ہے اور آج بھی مسلمان اس مسجد کو آباد رکھنے کو تیار ہیں۔

◄ امام احمدؒ کا جو قول مسجد کی تبدیلی کے جائز نہ ہونے کے سلسلہ میں ہے، وہ اُصولِ وقف سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ خود فقہ حنبلی میں وقف کے سلسلہ میں جو اُصول ہے، اس کو ممتاز حنبلی فقیہ ابن قدامہؒ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

(۱) الإنصاف:۱۶/ ۵۲۲ (۲) الموسوعة الفقهيه:۳۷/ ۲۲۳

ولايجوز التصرف فی الوقف بما ينقل الملک فی الرقبة لقول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی حديث عمر رضی الله عنه لايباع أصلها ، ولا يوهب ، ولايورث ، ولأن مقتضی الوقف التأبيد وتحبيس الأصل، بدليل أن ذلک من بعض ألفاظه، والتصرف فی رقبته ينافی ذلک۔(۱)

وقف میں ایسا تصرف جائز نہیں، جس کا تعلق اصل شئ کی ملکیت منتقل کرنے سے ہو؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے

حضرت عمرؓ سے فرمایا: اس کی اصل نہ فروخت کی جائے، نہ ہبہ اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی، اور اس لئے بھی کہ وقف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حیثیت ابدی ہو، اور اصل شئ کو باقی رکھا جائے؛ کہ یہی بات حضور ﷺ کے الفاظ سے مستنبط ہوتی ہے اور اصل شئ میں تصرف کرنا اس کے منافی ہے۔

اس کا تقاضا یہی ہے کہ امام احمدؒ کے یہاں اس قول کو ترجیح ہو، جو دوسرے فقہاء کی رائے کے مطابق ہے، کہ یہ وقف کے عمومی اور بنیادی قاعدہ کے مطابق ہے۔

◄ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بہت سے فقہاء حنابلہ نے مسجد کی تبدیلی کی رائے کی مخالفت کی ہے، الانصاف کے مصنف نے نقل کیا ہے کہ قاضی جمال الدین علاقی نے تبدیلئ مسجد والے قول پر فیصلہ کیا:

فعارضه القاضی جمال الدین المرداوی صاحب

(۱) الکافی: ۳/۵۸۰

"الانتصار" وقال حکمه باطل علی قواعد المذهب وصنف فی ذالک مصنفاً ردفیه علی الحاکم سماه "الواضح الجلی فی نقض حکم ابن قاضی الجبل الحنبلی" ووافقه صاحب "الفروع" علی ذالک۔

(۱)

تو قاضی جمال الدین مرداوی مصنف "الانتصار" نے اس سے سخت اختلاف کیا اور کہا کہ مذہب حنبلی کے قواعد کے

مطابق ان کا فیصلہ باطل ہے، اور اس سلسلہ میں قاضی کی

تردید کرتے ہوئے "الواضح الجلی فی نقض حکم ابن قاضی الجبل الحنبلی" کے نام سے ایک کتاب بھی تالیف فرمائی، نیز "الفروع" کے مصنف نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

اس لئے یہ قول خود فقہ حنبلی میں بھی ایک مرجوح اور نا معتبر قول ہے۔

◄ کسی شخص سے ایک سے زیادہ رائیں منقول ہوں اور ان میں باہم تضاد ہو، تو صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ دونوں آراء کی ایسی توجیہ وتشریح کی جائے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے موافق ہوجائیں اور ان میں تضاد باقی نہیں رہے، اس لئے امام احمدؒ کے دونوں قول کی اس طرح توضیح کرنی چاہئے کہ مسجد کو تبدیل کرنے کی ممانعت کا تعلق اس زمین سے ہے جس پر مسجد بنائی گئی ہو، کہ وہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہی رہے گی، اور تبدیلی ومنتقلی سے مراد مسجد کا ملبہ اور اس کی تعمیری اشیاء کی منتقلی ہے، جیسا کہ عام طور پر امام احمدؒ سے منقول ہے :

(۱) الانصاف:۱۶/ ۵۲۵

لا تباع المساجد لکن تنقل آلتها إلی مسجد آخر۔(۱)

مسجدیں نہیں بیچی جاسکتیں، لیکن اس کے اسباب وآلات دوسری مسجد کو منتقل کئے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح کی وضاحت علامہ شرف الدین مقدسی کی "الإقناع" اور فقہ حنبلی کی بعض اور کتابوں میں بھی ملتی ہے، (۲) —— اس طرح امام جلیل کے دونوں اقوال کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہتا، اس لئے یہی تشریح وتوضیح مناسب نظر آتی ہے۔

پس، گویا اہل سنت کے چاروں دبستانِ فقہ اس بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ مسجد کی

حیثیت دائمی ہوگی، اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، —— اہل سنت میں ایک مکتبہ فکر

اصحابِ ظواہر کا تھا، یہ گروہ امام داؤد ظاہری کا متبع تھا اور اس دبستانِ فقہ کے سب سے بڑے ترجمان علامہ ابن حزم ظاہریؒ تھے، ان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ مسجد انسان کی ملکیت سے نکل کر براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :

قال تعالی: وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (۳) فلایکون مسجداً إلا خارجا عن ملک کل أحد دون الله تعالی لا شریک له۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اس لئے مسجد سوائے اللہ تعالیٰ کے جس کا کوئی شریک نہیں، ہر شخص کی ملکیت سے باہر ہوگی۔

لہٰذا اگر اسے اُمت کا اجماعی مسئلہ قرار نہ دیا جائے، تب بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُمت کے سوادِ اعظم کا نقطۂ نظر یہی ہے۔

(۱) الانصاف: ۱۶/ ۵۲۲، الشرح الکبیر: ۱۶/ ۵۲۱، المقنع: ۵۲۱۱۶، وغیرہ
(۲) دیکھئے: الاقناع: ۳/ ۹۸، المعتمد: ۲/ ۲۱، وغیرہ (۳) الجن: ۱۸ (۴) المحلی: ۴/ ۱۶۲

ایک قابل توجہ پہلو

پھر اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مسجد کی جگہ کا مسجد باقی نہ رہنا، ایک الگ بات ہے اور اس کو بت خانہ بنادینا، دوسری بات ہے، جس جگہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ارادہ سے بنایا گیا ہے، اس کو غیر اللہ کی عبادت کا مرکز بنادینا، یا اس پر صلح کرکے اس کی اجازت دینا صریحاً ظلم اور تعدی ہے، کسی مسلمان کے لئے اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، قرآن مجید جو قیامت تک کے لئے ہے، اور جس کی نازل کرنے والی ذات یقیناً قیامت تک پیش آنے والے حالات و واقعات سے آگاہ اور علیم وخبیر ہے، اس کے اس ارشاد پر غور کیجئے کہ ’’مسجدیں اللہ ہی کے لئے

مخصوص ہیں، لہٰذا اللہ کے سواء (اس میں) کسی اور کی عبادت نہ کرو'' (۱)، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی سوچ کی تردید اور نفی کے لئے صرف مسجد کے اللہ کے لئے مخصوص ہونے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو جگہ مسجد کے لئے مخصوص ہو، یہ بات کبھی بھی گوارہ نہیں کی جاسکتی کہ کبھی اسے غیر اللہ کی عبادت کے لئے استعمال کیا جائے؛ اس لئے ان شاذ و نادر اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

مصلحت کا تقاضا

شریعت کے احکام میں عقل و مصلحت کا بھی ایک خاص درجہ ہے، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ شریعت کے تمام احکام کی بنیاد مصلحت و منفعت پر ہے، جو بات مصلحت کے بجائے مضرت اور نقصان و فساد کا باعث بنے وہ شریعت میں مطلوب نہیں ہوسکتی؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی مصلحت ہو جس میں نقصان کا پہلو نہ ہو، اور شاید ہی کوئی خلافِ مصلحت عمل ہو، جس میں کوئی پہلو نفع کا نہ ہو، غور کیجئے کہ زکوٰۃ و حج کتنی عظیم الشان عبادتیں ہیں، لیکن جو لوگ مادی عینک سے دیکھتے ہیں، انھیں اس میں نقصان نظر آتا ہے، کہ انسان بہت

(۱) الجن:۱۸

سارے پیسوں سے محروم ہوجاتا ہے، نماز میں وقت خرچ ہوتا ہے، اور جہاد میں جان جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، دوسری طرف شراب ہے، جو کتنی ہی برائیوں کی جڑ (اُم الخبائث) ہے، لیکن دو چار گھڑی ہی کے لئے سہی، سرور اس سے بھی حاصل ہوتا ہے، اور جُوّا باہمی نزاع و جدال کا سبب ہے، لیکن بعض اوقات جیتنے والے کو کچھ مادی نفع بھی حاصل ہوجاتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے کہا کہ بمقابلہ ان کے نفع کے ان کا گناہ زیادہ ہے، اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۱) —— اس لئے دیکھنا یہ ہوگا کہ مصلحت کا پہلو غالب ہے، یا نقصان و مفسدہ کا؟ اور اس کا مفاد بڑھا ہوا ہے، یا اس کی مضرت؟

مسجد کے مسئلہ پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے، ہندوستان میں اس وقت بابری مسجد کا مسئلہ جس گروہ نے اُٹھایا ہے، اس کے پاس اپنے موقف کے لئے کوئی دلیل وثبوت موجود نہیں ہے، نہ اس کے پاس تاریخی شہادت ہے، نہ علم الآثار کی تائید، نہ خود ان کی مذہبی کتابوں کا کوئی ثبوت، صورتِ حال یہ ہے کہ انگریزوں سے پہلے کبھی اس جگہ کے رام جی کی جائے پیدائش ہونے یا مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا، نہ ہندو مذہبی کتابوں میں اس مقام کی تعیین ملتی ہے، جہاں مسجد تعمیر کی گئی ہے، نہ موجودہ کھدائی نے ان فرقہ پرست عناصر کے موقف کی تائید کی ہے، اس کا مقصد محض مسلمانوں کی توہین اور شعائر اسلامی کی بے احترامی ہے، اور اس مسجد کو قانون اور اخلاق کے علی الرغم غیر قانونی طور پر بت کدہ بنانے کی کوشش جاری ہے۔

ان حالات میں اگر مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیا اور سپر اندازی اختیار کی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرقہ پرستوں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے اور اپنے ناپاک منصوبوں کو روبہ عمل لانا ان کے لئے آسان ہو جائے گا؛ کیوں کہ اس طرزِ عمل سے ظالموں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں، اور مظلوموں میں اپنی عزت نفس کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی ہمت ختم ہوتی جاتی ہے، سنگھ

(١) البقرہ:٢١٩

پریوار کے سامنے صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ پوری طرح غیر ہندو اقوام کو ہندو مذہب یا کم از کم ہندو تہذیب میں جذب کر لینا ان کا مسأ ومقصود ہے، اذان کی آواز بھی ان کی طبع نازک پر گراں گذرتی ہے، انھیں یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ مسلمان اسلامی اور عربی نام رکھیں، ملک میں جگہ جگہ عظیم الشان مسجدیں اور ان کے بلند مینارے ان کے لئے گراں خاطر ہیں، اب وہ مسلمانوں کو اس بات کی بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہندو تیوہاروں میں شرکت کریں، کیا یہ باتیں مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں؟ اگر آپ نے ایک محاذ پر اپنی شکست قبول کر لی تو یقیناً آپ کو بتدریج ہر محاذ پر پیچھے ہٹنا پڑے گا۔

دوسرے: موجودہ جبر ودباؤ کے ماحول میں اگر مسجد انھیں سونپ دی جائے، تو یہ مجرموں کو انعام دینے کے مترادف ہوگا اور یہ رجحان پیدا ہوگا کہ پہلے جرم وزیادتی کا ارتکاب کرو، بالآخر اسے سند جواز حاصل ہوجائے گا، اور وہ بات قبول کرہی لی جائے گی، ایسی سوچ کا پنپنا اور اس کو قوت حاصل ہونا نہایت خطرناک بات ہے، اور اس سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ دوسری مذہبی اقلیتوں اور دلتوں پر بھی جور وظلم کی راہ ہموار ہوگی، اس سوچ کو لگام دینا نہ صرف مسلمانوں کے مفاد میں ہے؛ بلکہ اس ملک سے محبت اور بہی خواہی کا بھی عین تقاضا ہے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب مسجد کے معاملہ میں ایسی صلح نہ کی جائے جو ان کی مجرمانہ حرکتوں کو جواز بخشتی ہو۔

تیسرے: مسئلہ اُصول کا ہے، اگر ایک مسجد کے بارے میں یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ اسے مندر بنایا جاسکتا ہے اور اس مقصد کے لئے حکومت کے حوالہ کیا جاسکتا ہے، تو پھر متھرا اور بنارس کی عیدگاہ اور مسجد بھی نشانہ پر ہیں، اور سنگھ پریوار کی فہرست میں تو تین ہزار مسجدیں پہلے سے موجود ہیں، اور کچھ ان ہی مساجد پر موقوف نہیں، پھر تو دلی کی جامع مسجد اور حیدرآباد کی مکہ مسجد پر بھی وار ہوسکتا ہے، اور کسی بھی مسجد کے بارے میں مسلمانوں سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ جب ایک مسجد کی حیثیت تبدیل ہوسکتی ہے، تو دوسری مسجد کی حیثیت بھی بدلی جاسکتی ہے، —— اس لئے بابری مسجد کے مسئلہ میں دست برداری کا رویہ اختیار کرنا پوری طرح مصلحت اور اُمت کے مجموعی مفاد کے بھی خلاف ہے۔

بعض حضرات خیال کرتے ہیں کہ بابری مسجد سے دست برداری اختیار کرلینے کی صورت میں فسادات تھم جائیں گے، اور مسلمانوں کے ساتھ جو معاندانہ رویہ اس وقت روا رکھا جارہا ہے، اسے روکا جاسکے گا، لیکن یہ محض غلط فہمی بلکہ خوش فہمی پر مبنی ہے، ہندوستان میں ایودھیا کا مسئلہ ۱۹۴۵ء میں شروع ہوا، جب مسجد سے باہر کے چبوترے پر رام مندر کے لئے دعویٰ کیا گیا، اور اصل مسجد کا مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا، جب اڈوانی نے رتھ یاترا شروع کی تھی؛ کیوں کہ

راجیوگاندھی کے شیلانیاس رکھنے کے وقت بھی وی-ایچ-پی نے تحریری تیقن دیا تھا کہ وہ مسجد کی جگہ کو چھوڑ کر مندر بنائیں گے؛ لیکن کیا اس سے پہلے ہندوستان میں فسادات نہیں ہوئے، ۱۹۴۷ء میں فسادات کے وقت کیا بابری مسجد کا مسئلہ تھا؟ پھر راوڑکیلا، جمشید پور، میرٹھ، مرادآباد اور ملک کے مختلف حصوں میں جوخوں ریز فسادات ہوئے، اس وقت کیا بابری مسجد کا مسئلہ تھا؟ ہندوستان میں بہت معمولی اسباب کے تحت اور اکثر اوقات محض شرارت کی بنیاد پر فسادات ہوئے ہیں، کبھی گاؤکشی کے نام پر، کبھی ہندو تیوہاروں کے موقع پر، کبھی اس لئے کہ مسجد کے سامنے سے گذرنے والے جلوس نے مسجد کی بے احترامی کی، وغیر ذالک، اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ ختم ہوگیا تو فسادات تھم جائیں گے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک جگہ مسلمانوں نے اس مسئلہ میں ظلم کو قبول کرلیا اور پسپائی اختیار کی، تو ہر ہر شہر میں معرکہ آرائی شروع ہوجائے گی، مختلف مساجد اور مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر حملہ ہوگا، ان کی حیثیت بدلنے کی کوشش کی جائے گی اور اس وقت اسے تھامنا ممکن نہ ہوگا۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن کے خون کی اہمیت، حرمتِ مسجد سے زیادہ ہے، اس لئے مسجد حوالہ کردینی چاہئے، لیکن ایک تو یہ سوچنا ہی درست نہیں ہے کہ بابری مسجد سے دستکش ہوجانے کی صورت میں مسلمانوں کا خون محفوظ ہوجائے گا، اور اس سلسلہ میں تجربات سامنے ہیں، لیکن علاوہ اس کے مساجد شعائر اسلام کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لئے ان کی حفاظت جان اور زندگی کی حفاظت سے بھی بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من قتل دون دینه فھو شھید'' (۱)، جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، دین میں عقیدہ بھی شامل ہے، عمل بھی اور اس کے مقدس مقامات بھی، ورنہ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کے لئے مساجد کو قربان کرسکتے ہیں، تو یہی بات مسجد اقصیٰ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، کہ مسلمان یہودیوں کے مطالبہ کے مطابق اس جگہ ہیکل سلیمانی

کی تعمیر کو قبول کرلیں، تاکہ فلسطینیوں اور عربوں کا خون محفوظ ہو جائے، والعیاذ باللہ۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکی زندگی اس طرح گذاری کہ کعبۃ اللہ میں اور اس سے باہر سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ نے اس پر خاموشی اختیار کی، اس لئے مسلمانوں کو رام مندر کی بات قبول کر لینی چاہئے؟ —— یہ سراسر مغالطہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کعبۃ اللہ یا اس کے گرد و پیش شرک کو قبول نہیں فرمایا، آپ ﷺ نے ان سے اس کو بت کدہ رکھنے پر کوئی صلح نہیں کی، بلکہ چوں کہ مسلمان مجبور تھے؛ اس لئے سکوت اختیار فرمایا، اور جوں ہی اس کی اصل حیثیت کو بحال کرنے کی قدرت حاصل ہوئی، آپ ﷺ نے خانۂ خدا کو شرک کی آلائشوں سے محفوظ فرما دیا، ہندوستان میں مسلمانوں کا موقف یہی ہے کہ ہم اس مسجد کو حوالہ نہیں کریں گے، اور قانون و آئین کی حدود میں رہتے ہوئے اپنی طاقت کے مطابق اللہ کے گھر کی حفاظت کریں گے، نیز قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے، یہی وہ طریقۂ کار ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے مکی زندگی میں اختیار فرمایا تھا۔

اس سلسلہ میں کچھ لوگ صلح حدیبیہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندو فرقہ پرستوں

(۱) ابوداؤد: ۴۷۷۲، باب فی قتال اللصوص

سے ''صلح حدیبیہ'' کرنی چاہئے؛ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ صلح حدیبیہ میں اپنی دینی شناخت سے دست برداری اور اسلامی تشخصات سے محرومی کی قیمت پر کوئی صلح نہیں کی گئی تھی، دوسرے یہ صلح حدیبیہ یکبارگی نہیں ہوئی تھی، آخر مکی زندگی میں یہ صلح کیوں نہیں ہو سکی، بدر و احد اور خندق کی جنگیں ہوئیں اور اس وقت یہ صلح کیوں نہ ہو پائی، حالاں کہ حضور ﷺ تو ہمیشہ سے صلح چاہتے تھے، جب غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ طاقت کا استعمال کر لیا گیا اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، تبھی صلح حدیبیہ ہو سکی؛ اس لئے یہ خیال کرنا کہ موجودہ حالات میں (جب کہ فرقہ پرست عناصر بام اقتدار پر چڑھ کر برہنہ رقص

کرنے کے موقف میں ہیں) ان سے صلح حدیبیہ ہو سکے گی ، محض بھول اور خوش فہمی ہے، اس حالت میں ایسی ہی صلح ہو سکتی ہے، جس میں ایک گروہ اپنی مظلومیت کو قبول کر لے اور مستقل طور پر اسی حالت میں رہنے کو آمادہ ہو۔

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ کتاب وسنت، اُمت کے سوادِ اعظم کے اتفاق اور مصلحت ہر پہلو سے اس مسئلہ میں اُمت کے اس موقف سے انحراف درست نہیں ؛ بلکہ مسجد سے دستبرداری سراسر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے، اور اگر بالفرض اس کو قبول کرلیا گیا تو یہ ایسی ہزیمت اور پسپائی ہوگی کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر پیچھے ہٹنا ہوگا ، اور ہر مطالبہ پر سر تسلیم خم کرنا پڑے گا، یہاں تک کہ ان کے لئے خدانخواستہ اور ہزار بار خدانخواستہ اپنی شناخت کو باقی رکھنا بھی دشوار ہو جائے گا، واللہ ھو المستعان۔

vvvvvv